اسلام کا نظامِ معدلت

"دنیا مومن کے واسطے ایک دوسری بہتر دنیا (عالم آخرت) کے لیے صرف ایک گذرگاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور قرآن پاک دوسرے افراد اور معاشرہ کے ساتھ اس سفر کو پُرامن بنانے کے لیے معاشرتی اصولوں کی تدوین کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ سیاسی یا قانونی نظریات کو پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات سے علاحدہ کر دیا جائے جن سے مذہبی، خانگی، سماجی اور سیاسی زندگی سے متعلق طرزِ عمل کے اصول قائم ہوئے ہیں۔"

(رابرٹ ہاوٹ جیکسن —— شریک جج سپریم کورٹ ممالک متحدہ امریکہ)[1]

اسلام میں انصاف کا اصل سرچشمہ خداوند تعالیٰ کی ذات ہے اور اس سرچشمہ سے پیدا ہونے والے قوانین کا نفاذ مسلمانوں کی جماعت کے سپرد کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسلام نے قضا یا دادرسی یا عدل گستری کو اہم ترین انسانی فرائض میں شامل کرتے ہوئے اسے مملکت کا اوّلین فرض قرار دیا ہے۔ عدل و انصاف کی اہمیت کے سلسلہ میں قرآن پاک میں جابجا آیا ہے کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا کرو تو عدل سے فیصلہ کیا کرو[2]۔ کسی کی عداوت کی وجہ سے تم عدل سے باز نہ رہو۔ بلکہ عدل کرو جو پرہیزگاری کا تقاضا ہے[3]۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اے ایمان والو انصاف پر قائم رہو اور اللہ کی طرف گواہی دو اگرچہ اپنا یا ماں باپ یا قرابت والوں کا نقصان ہو[4]۔"

ایک اور سورۃ میں داؤد علیہ السلام کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "اے داؤد!

(۱) LAWS IN THE MIDDLE EAST - مجید خدوری۔ واشنگٹن ۱۹۵۵ء۔ پیش لفظ (۲) وَاِذَا حَكَمْتُمْ بین الناس ان تحکموا بالعدل (سورہ نساء ۸:۸) (۳) ولا یجرمنکم شنآن قومٍ علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (سورہ مائدہ - ۲۵-۳) (۴) ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علیٰ انفسکم او الوالدین والاقربین (سورہ نساء ۲۰-۱)

ہم نے تم کو اس زمین پر اپنا خلیفہ بنایا اس لیے تم لوگوں کے درمیان حق پر فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی مت کرو کیونکہ تم اس سے اللہ کے راستہ سے ہٹ جاؤ گے"[1]۔ اسی طرح بیشتر احادیث نبوی میں بھی انصاف رسانی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ صرف ایک ہی حدیث اسلام میں انصاف کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ

"ایک ساعت جو انصاف میں صرف کی جائے ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے"[2]۔

در حقیقت اسلام نے دادرسی کو واجب کفائی اور مستحب عینی قرار دیا ہے"[3]۔

سرخسی (SARKHASI) نے اپنی کتاب المبسوط میں لکھا ہے کہ "اسلام میں انصاف کا انحصار مذہبی اصول کے اطلاق پر ہے" اس لیے" اس میں کسی مادی تصور کا دخل نہ ہونا چاہیئے"[4]۔

اسی طرح خشانی (KHUSHANI) نے انصاف رسانی کو مذہب کا ایک اہم اصول بتاتے ہوئے کہا ہے کہ" عدالتی فرائض کی انجام دہی محض مذہبی نوعیت کا ایک فرض منصبی (PUBLIC DUTY) نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور مذہبی فریضہ کی تکمیل ہے۔ جس میں خوف خدا اور خشیت الٰہی شامل ہے اور یہی وہ تصور ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے ایک قاضی یا جج کے اعمال و افعال کا جزو بن جاتا ہے اور اس کو اپنے عدالتی فرائض کی بجا آوری میں رشد و ہدایت اور مشعل راہ کا کام دیتا ہے"[5]۔

چنانچہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا تو ایک فرمان کے ذریعہ انہیں ہدایت کی کہ" قضا ایک خدائی فریضہ ہے اور پیغمبر اسلام کا واجب التعمیل حکم نیز طرز عمل..... ..... اگر تمہارے پاس کوئی مقدمہ دائر ہو تو غور و فکر کے بعد پوری طرح سمجھ کر فیصلہ کرو اور تعمیل کراؤ بغیر تعمیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بے کار ہے۔ فریقین سے برابری کا برتاؤ کرو تاکہ کمزور تمہارے عدل سے مایوس نہ ہو جائے اور طاقتور اس سے بے جا فائدہ نہ اٹھائے .... اگر کسی بات کے فیصلہ میں قرآن اور سنت میں کوئی چیز نہ ملے تو خوب غور و فکر کرو اور نظائر اور مماثل امور کو

---

(۱) یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ (سورہ ص ۲:۲۶) (۲) SAYINGS OF PROPHET میرزا ابوالفضل ص ۷۶، حدیث ۳۰۸ (۳) آئین دادرسی اسلام سید محمد سنگلجی (تہران، ص ۹-۱۰) (۴) المبسوط (قاہرہ)، جلد ۱۶ ص ۶۷ (۵) LAW IN THE MIDDLE EAST مجید قدوری و واشنگٹن، ص ۲۴۳ (۶) اسلام میں عدل گستری۔ عبدالحفیظ صدیقی

ڈھونڈ کر قیاس کرو اور ایسا فیصلہ کرو جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو۔"

جہاں تک عدالتوں کے قیام اور اس کے نظام کا تعلق ہے۔ ابتدا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود مقدمات کا فیصلہ فرماتے تھے لیکن مدینہ ہجرت کرنے کے بعد آپؐ نے دو قاضیوں کا تقرر فرمایا۔ آپؐ ان قاضیوں کے فیصلہ کے خلاف اپیلیں سنا کرتے تھے۔" حضرت عمرؓ کے عہد میں عدالت کا ایک جداگانہ صیغہ بن گیا۔ خلافت کی صوبہ واری تقسیم کے بعد ہر ضلع میں عدالتیں قائم کی گئیں اور قاضی مقرر کیے گئے۔"

قاضیوں کا تقرر، برطرفی یا تبادلہ براہِ راست خلیفہ خود کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ یہ اختیار گورنر کو تفویض کرتا جو اپنے صوبہ میں قاضی مقرر کرتا تھا جو خلیفہ یا گورنر کے نائبین کی حیثیت سے قضاۃ کا کام سرانجام دیا کرتے تھے۔ خلافتِ راشدہ اور بنو امیہ کے عہدِ حکومت تک سارے قاضی براہِ راست خلیفۂ وقت سے متعلق رہے لیکن عباسیوں کے دورِ حکومت میں خلیفہ ہارون الرشید نے محکمہ قضا اور قاضیوں کی براہِ راست نگرانی کے لیے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ قائم کیا۔ اس عہدہ پر سب سے پہلے امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد امام ابو یوسف کا تقرر عمل میں آیا۔ اس زمانہ سے قاضی القضاۃ کو قاضیوں کے عزل و نصب اور تبادلہ کے مکمل اختیارات حاصل ہو گئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نہ صرف خلفائے راشدین بلکہ ہارون الرشید اور اس جیسے دیگر مطلق العنان فرمانروا بھی قانون کی برتری اور عدالت کی سربلندی کے آگے بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کرتے رہے ہیں۔

خلافتِ راشدہ میں تمام قاضیوں کے علاوہ ایک عہدہ "قاضی العساکر" کا بھی تھا۔ یہ قاضی مجاہدین کے ساتھ جہاد میں جاتے۔ مجاہدین کے نزاعات یا نئے مفتوحہ علاقوں میں عدالتی فرائض انجام دینا نئی عدالتیں قائم کرنا ان کے فرائض میں تھا۔ علاوہ ازیں اسلام میں ایک عہدہ "محتسب" کا بھی پایا جاتا ہے۔ محتسب دراصل قاضی ہی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے دائرہ اختیار میں ایسے امور تھے جو بلدیات کے احکام کی خلاف ورزی سے متعلق ہوں نیز عوام الناس کے آداب و اخلاق کی نگرانی، گراں فروشی کی روک تھام، اور ٹریفک کا انتظام بھی محتسب سے متعلق تھا۔ بعض اوقات خصوصی مقدمات کی سماعت کے لیے خاص عدالتیں تشکیل کی جاتی تھیں۔ الماوردی کا بیان ہے کہ فوجیوں کے باہمی نزاعات کے تصفیہ کے لیے خصوصی جج مقرر کیے جاتے تھے۔ مگر خاص عدالتوں کے اختیارات ہمیشہ محدود ہوتے تھے۔

اسلام میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کے لیے علاحدہ عدالتیں نہیں تھیں بلکہ ہر ایک قاضی اپنے علاقہ میں بلاتخصیص مقدمات کی سماعت کیاکرتا تھا۔

اسلامی عدالتوں میں صرف ایک ہی قاضی اجلاس کیاکرتا تھا۔ موجودہ نظام ہائے عدالت کی طرح اجلاس متفقہ یا کاملہ کا دستور نہ تھا۔

اسلام میں مشاورت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ آغاز اسلام ہی سے عموماً اور خلفائے راشدین کے عہد میں خصوصاً مقدمات کے فیصلوں میں اہل علم و بصیرت اصحاب سے مشورے لیے جاتے تھے۔ چنانچہ اسلام کے اچھے اور برے ہر دور میں یہ طریقہ برابر رائج رہا ہے کہ قاضیوں کی امداد کے لیے مفتیانِ شرع پر مشتمل مجلس مشاورت قائم تھی۔

اسلام میں قانون کی بالادستی اور بے خوف و خطر انصاف رسانی کے پیش نظر عدلیہ کو ایسا سربلند مقام عطا کیا گیا ہے کہ آج کی متمدن دنیا میں بھی کوئی اور مذہب یا نظام صحیح معنی میں اس کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے نظامِ معدلت میں عدلیہ (JUDICIARY) عاملہ (EXCECTIVE) سے علاحدہ ممتاز اور کاملاً آزاد رہی ہے تاکہ عدلیہ کے عاملہ کے ماتحت ہونے سے انصاف متاثر نہ ہو چنانچہ وان ہمیر (VON HAMMAR) لکھتا ہے کہ "اسلامی نظام اپنی ابتداہی میں الفاظ اور افعال (زبانی اور عملی) ہر دو اعتبار سے عدلیہ اور عاملہ کے مابین تفریق کا اعلان کرتا ہے[1]۔"

اسلامی نظریہ انصاف سختی کے ساتھ مساوات کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا اطلاق اعلےٰ و ادنیٰ، چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب پر یکساں صورت میں ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "اگر کوئی غنی یا محتاج ہے تو اللہ تعالےٰ تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ ہے۔ اس لیے تم اپنے جی کی بات نہ مانو اگر تم بات بدل ڈالو یا کسی کو بچانے کی کوشش کرو تو اللہ تعالےٰ تمہارے ہر کام سے واقف ہے[2]۔"

چنانچہ معاملہ اگر عدل و انصاف کا ہوتا تو اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہ ہوتی۔ بڑے سے بڑا جلیل القدر سلطان اور ایک معمولی شخص عدالت میں ایک ہی کٹہرے میں نظر آتے کسی کی سعی و سفارش کی قطعاً

---

(1) HISTORY OF SARACENS سید امیر علی، لندن، ص ۶۲ (۲) ان یکن غنیاً او فقیراً فاللہ اولیٰ بھما فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا و ان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا (سورہ نساء ۴-۱۳۵)

ممانعت تھی چنانچہ آنحضرتؐ کا مشہور تاریخی قول آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے کہ "محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی اگر چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیا جائے گا"[1]۔

اسلامی نظامِ معدلت میں ثبوت اور شہادت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل گستری کا بنیادی اصول یہ قرار دیا ہے کہ "بغیر ثبوت کے کسی دعوی کو صحیح نہیں مانا جاسکتا"[2]۔ چنانچہ احادیث میں تنقیح طلب امور اور پیش شدہ شہادت کی جانچ کے لیے بہت سے احکام ملتے ہیں۔

اسلامی نظامِ معدلت میں قانون شہادت کی ایک سب سے نمایاں خصوصیت جو دنیا کے کسی دوسرے نظامِ معدلت میں نظر نہیں آتی یہ ہے کہ گواہوں کا نصاب مقرر ہے۔ یہ امر پہلے ہی سے متعین ہے کہ کس جرم یا مقدمہ میں کم از کم کتنے گواہ ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح گواہوں کی اہلیت وغیرہ سے متعلق بھی تفصیلی احکام موجود ہیں لیکن قانونِ شہادت کے سلسلہ کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ گواہ کے چال چلن کی تحقیقات کی جاتی تھی کہ آیا وہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ اس اصول کو اصطلاح میں "تزکیہ شہود" کہا جاتا ہے اس کا وجود عہد نبوی ہی سے ملتا ہے۔ خلافت راشدہ میں اس کو بہت ترقی ہوئی۔ اور تحقیقات خفیہ بھی کی جانے لگی۔ چنانچہ محکمہ قضاۃ میں گواہوں کے علاحدہ رجسٹر بھی ترتیب دیے جاتے تھے۔

اسلامی نظریہ انصاف کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ فیصلہ سختی کے ساتھ قانون کے مطابق ہونا چاہیے اور قاضی یا جج کو سیاست اور حکومت وقت کے میلانات و رجحانات سے کسی طرح متاثر نہ ہونا چاہیے[3]۔

اسلام میں انصاف شخص متضرر کا حق قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کی لازمی شرط یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ بلامعاوضہ ہو۔ چنانچہ مدعی کو رسومِ عدالت (COURT FEES) کی قسم سے کوئی زیر باری نہ تھی[4]۔

اسلام نے دیگر نظام ہائے عدالت کی طرح عدالتی کارروائیوں کے مشتہر اور عام کرنے پر زور دیا ہے۔ چنانچہ اسلام میں کھلی عدالتوں اور عدالت میں زبانی بیانات پر ابتدا ہی سے عمل کیا جاتا رہا ہے اسلام کے نظامِ معدلت میں وکلاء کا موجودہ طریقہ (SYSTEM) نافذ نہیں تھا البتہ وکیل کے

---

(۱) بخاری شریف (۲) مسند امام حنبل

(۳) "نظام الحکم فی الاسلام" مؤلفہ علامہ تقی الدین نبہانی مترجمہ مولانا منظور علی کامل، ص ۹۲

(۴) ADMINISTRATION OF JUSTICE OF MUSLIM LAW محمد اللہ جنگ ص ۹

بحیثیت کارندہ یا مختار کام کرنے کا وجود پایا جاتا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں کتاب الوکالت کے نام سے ایک باب پایا جاتا ہے مگر وکیل کی حیثیت موجودہ کارندہ یا مختار کی سی تھی۔ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ مگر لیا جانا لازمی نہ تھا۔ اصطلاح میں مقدمات کی پیروی کرنے والے وکیل کو وکیل الخصومۃ کہا جاتا تھا۔ اگر محنتانہ طے نہ ہوا ہو مگر اس کا ادا کیا جانا مقصود ہو تو ایسی صورت میں بہ لحاظ نوعیت مقدمہ یا حیثیت شخصی اجر المثل دلایا جاتا تھا۔

قاضی تاج الدین ابوالنصر عبدالوہاب السبکی نے اپنی کتاب معید النعم و مبید النقم میں اس پیشہ کے جواز اور شرائط کے متعلق لکھا ہے ——— "ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ وکالت سے جن وکلاء کا مقصود ذاتِ خداوندی کی خوشنودی ہو وہ مستحقِ تعریف ہیں گو وہ اس کا محنتانہ ہی کیوں نہ لیں۔ لیکن جو وکلاء صرف مقدمہ لڑنا اور حقوق کو باطل کرنا چاہتے ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔ وکلاء کا فرض یہ ہے کہ مؤکل سے صورت معاملہ کو خوب سمجھ لیں واقعہ سے واقف ہو جائیں اور یہ معلوم کرلیں کہ حق کس طرف ہے . . . . . . وہ دلیل ایسی پیش کریں جس کو وہ صحیح سمجھتے ہیں . . . . . لیکن اگر وہ اس کو جھوٹ سمجھنے کے بعد بھی پیش کریں تو ان کا ٹھکانا جہنم میں ہے"۔

ایک بڑے اہم موضوع پر اس مختصر مضمون میں اسلام کے نظامِ معدلت کا صرف ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ موضوع اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس امر کا متقاضی ہے کہ اس پر شرح و بسط کے ساتھ اپنے افکار و عقائد کا اظہار کیا جائے۔

تاریخِ جمہوریت

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

قبائلی معاشروں اور یونانِ قدیم سے لے کر عہدِ انقلاب اور دورِ حاضرہ تک جمہوریت کی مکمل تاریخ جس میں جمہوریت کی نوعیت دارتقار، مطلق العنانی اور جمہوریت کی طویل کش مکش، مختلف زمانوں کے جمہوری نظامات اور اسلامی و مغربی جمہوری افکار کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ صفحات ۵۰۶ - قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور